شہزاد احمد کی غزل میں تلاش و تشکیک

ڈاکٹر روبینہ شائستہ، لیکچرار، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ، لاہور

Abstract

Shehzad Ahmad is one of the most prominant urdu poet after partition. He has his own diction in poetry because of his background knowldge of philosophy and psychology. In this article, the element of quest is discussed.

جدید اُردو غزل کی آبیاری کرنے والوں میں ایک نمایاں نام شہزاد احمد کا ہے۔ شہزاد احمد بطور غزل گو اور نظم گو۔ دونوں حیثیتوں میں اپنا مقام رکھتے ہیں لیکن بنیادی حیثیت غزل گو شاعر کی ہے جس کا اعتراف معاصر ناقدین نے کیا ہے۔

شہزاد کی غزل پر نفسیات، فلسفہ اور سائنسی علوم کے اثرات غالب ہیں۔ امجد اسلام امجد لکھتے ہیں:

> ''فلسفہ اور نفسیات کی باضابطہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے ترجمے کے حوالے سے کچھ سائنسی موضوعات سے بھی راہ رسم پیدا کی ہے جس کا اثر اس کی نثری تحریروں میں تو نمایاں ہے ہی۔ شاعری میں بھی جگہ جگہ اس کا پرتو نظر آتا ہے۔''[۱]

فلسفہ کے زیرِ اثر ان کے لاشعور میں موجود مختلف سوالات شاعری کا حصّہ بنتے ہیں اور وہ حیات و کائنات کے متعلق مختلف سوال کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

مری تخلیق کس مقصد سے کی تھی؟
تجھے بھی کیا کھلونا چاہیے تھا؟ [۲]

☆

بکھرے ہوئے تاروں سے مری رات بھری ہے
یہ نور ہے یا نور کی دریوزہ گری ہے [۳]

شہزاد کائنات، خُدا، زندگی اور موت کے بارے میں مختلف سوالات اُٹھاتے ہیں۔ وہ تخلیق کے فلسفے کو اپنے دل کے نازک محسوسات کی مدد سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر نیّر صمدانی لکھتے ہیں:

> ''شہزاد احمد کا ہست و بود کے مسئلے پر عدم اطمینان درحقیقت اس کے حساس دل کی آواز ہے حالانکہ یہ تمام سوال اپنے جواب کی آرزو میں ازل سے بے آسرا بھٹک رہے ہیں البتہ ان سوالوں کی گونج سے

شہزاد احمد کی شاعری میں سوز کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔'' ۴

یقیناً یہی بات ہے کہ یہ تمام سوال اپنے جواب کی آرزو میں ازل سے بے آسرا بھٹک رہے ہیں لیکن شہزاد کا کمال یہ ہے کہ وہ اِن سوالوں کی مدد سے نئے سُراغ لگاتے ہیں اور یہ سُراغ اپنے ساتھ مزید کئی سوال لے کر آتے ہیں۔

اتنا کٹھن تھا راستہ چیخ اُٹھے تھے نقشِ پا
ہم نے تو آج پا لیا، ایک سُراغ اور بھی ۵

شہزاد کے ہاں تلاش اور تشکیک کا جو رویہ اُن کی ابتدائی شاعری میں نمایاں تھا اس نے زندگی کے ہر موڑ پر اُن کا ساتھ نبھایا ہے۔

برق رفتاری سے گزرتے ہوئے لمحوں کی ازلی حیرت سے لے کر بلیک ہول کے عظیم بحر تک اُن کی شاعری کائنات کے بارے میں مسلسل بنیادی سوال اُٹھاتی نظر آتی ہے۔

شہزاد کی زندگی کی آخری کتاب ''مٹی جیسے لوگ'' ہے جس میں یہی رویہ برقرار ہے۔ البتہ شہزاد کی پختگیٔ عمر و پختگیٔ سخن اُن کی شاعری کو اِس مقام تک لے آتی ہے کہ وہ ایسے سوالات بھی کرنے لگے ہیں۔

ہمیں شہزاد بھٹکایا گیا تھا
اور اب رستہ دکھایا جا رہا ہے ۶

تشکیک کا جو عنصر اِس غیر استفہامیہ شعر میں چھپا پڑا ہے، وہ شہزاد کو اللہ سے شوخی کے درجے تک لے گیا ہے۔ اِسی قسم کی چند اور مثالیں ''مٹی جیسے لوگ'' کی غزلوں میں موجود ہیں۔

اُس نے ہمیں بے راہ روی کا رستہ بھی دکھلایا
توبہ کا دروازہ جس نے ہم پر کھول دیا ہے ۷

☆

روزِ ازل ہی دے دیے تو نے بھی ہاتھ کاٹ کر
اپنے لکھے ہوئے حروف تو بھی مٹا نہیں سکا ۸

شہزاد کی شاعری میں معنی کی اتنی جہتیں ملتی ہیں کہ ہر بار پڑھنے پر نئے معنی برآمد ہوتے ہیں۔ انسان کی تنہائی اور اُس تنہائی میں اُس کا کلپنا۔ یہ شہزاد کا خاص اور محبوب موضوع ہے۔ اُن کے نزدیک انسان ہمیشہ سے اکیلا ہے۔ اُس کا ذہن ایک انفرادی کمپیوٹر کی مانند ہے جو اپنی مرمت (Repair) خود کرتا ہے۔ وہ اپنے ہی وجود سے برسرِ پیکار ہے کیونکہ ذہنی ساخت مختلف ہونے کے باوجود انسانی وجود جسمانی اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔ انسانی ذہن سے نکلنے والی مختلف سوچیں اور اُن سوچوں سے اُبھرنے والے متنوّع موڈ (Moods) آپس میں متصادم رہتے ہیں اور انسان کی داخلی اور روحانی کیفیت خارجی مناظر کو اُس کے منظرنامے سے ہٹا دیتی ہے۔

نہ ستارے، نہ زمینیں، نہ ضیا
کوئی موجود نہیں میرے سوا ۹

☆

تیرے جیسا کچھ موجود نہیں ہے، سارے فلک پر
اے دھرتی کے رہنے والے! تو کتنا تنہا ہے [۱۰]

شہزاد کے ہاں انسان کی تنہائی کا یہ فلسفہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ دُنیا کے واسطے، وسیلے انسان کے کسی کام کے نہیں۔ آخری عدالت میں بھی اُسے تنہا اپنے اعمال کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔

کلاسیکی اُردو شاعری کی روایت کو شہزاد نے خوب نبھایا ہے اور اُن کی غزل میں محبوب کا تصور بھی موجود ہے گو کہ یہ تصور مبہم ہے۔ اُن کی روایتی تلاش اُن کے تصوراتی اور خیالی محبوب کی واضح تصویر بھی بننے نہیں دیتی۔ ایک موہوم سی تصویر بنتی ہے:

نہیں بکھرا چراغوں کا دھواں بھی
ترے پیکر میں ڈھلتا جا رہا ہے [۱۱]

☆

وہی دامن تو میری زندگی تھا
جو ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے [۱۲]

☆

ہم کو دیکھ کے آج تو اُس نے آنکھیں نہیں چُرائیں
ہم نے جو خط لکھا تھا وہ برسوں بعد ملا ہے [۱۳]

شہزاد کی غزل تلاش اور جستجو کے اتنے پرت کھولتی ہے کہ صاحبِ بصیرت قاری بھی شہزاد کے ساتھ مِل کر اِن پرتوں کو کھولنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ جستجو بے سود رہتی ہے کیونکہ ہر بار قاری کو جواب کی تلاش نئے سوالات سے دوچار کرتی ہے جبکہ شہزاد بے بسی سے کہہ دیتے ہیں:

اے جہاں! کب ترے اسرار کُھلیں گے مجھ پر
اے جنوں! کب مری وحشت میں کمی آئے گی [۱۴]

احمد جاوید نے شہزاد کی کتاب ''معلوم سے آگے'' کے حوالے سے لکھا تھا:

> ''انسان کی حقیقت انسان کے نا ہونے سے مشروط ہے اِسے پانے کے لیے جو چیز کھونی پڑتی ہے وہ خود انسان ہے۔ شہزاد احمد میٹا فزیکل تصورات کو رد کیے بغیر ان سے ایک محفوظ فاصلہ رکھ کر آدمی کی اس اوریجنل ساخت تک پہنچنا چاہتے ہیں جو نفسیات کی دسترس سے باہر ہے اور یونیورسٹی کے اِس نیم تجربی، نیم امکانی سٹرکچر سے مناسبت نہیں رکھتی جو ایسے سائنس دانوں کی دریافت یا ایجاد ہے جو شاید شاعر یا فلسفی بننا چاہتے تھے مگر نہیں بن سکے۔'' [۱۵]

آسمان و زمین کی بے کراں وسعتیں اپنے اندر کئی اسرار چُھپائے ہوئے ہیں سائنس اور فلسفے کے گہرے مطالعے نے شہزاد احمد کے ہاں انہی اسرار سے متعلق فکری عناصر اور فکر کی نئی جہات پیدا کیں۔ اُن کا یہ اندازِ فکر جہاں نفسیاتی

پیچیدگیوں کی تفہیم میں مدد کرتا ہے وہیں قاری کے دل و دماغ کو مسخر بھی کرتا ہے اُن کے اِسی اندازِ بیان نے انہیں معاصرین میں انفرادیت بخشی ہے۔

حواشی:

۱۔ امجد، امجد اسلام، شہزاد احمد.....تلاش اور تشکیک کا شاعر، مشمولہ ماہنامہ ''سپوتنک''، جولائی ۲۰۰۰ء، ص: ۵۲

۲۔ شہزاد احمد، آنے والا کل، لاہور: ملٹی میڈیا افیئر، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۷۱

۳۔ شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص: ۵۱

۴۔ نیّر صمدانی، ڈاکٹر، اعتبارات، لاہور: وکٹری بک بنک، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۴۶

۵۔ شہزاد احمد، آنے والا کل، ص: ۱۲۱

۶۔ شہزاد احمد، مٹی جیسے لوگ، لاہور: ملٹی میڈیا افیئر، ۲۰۰۹ء، ص: ۲۳

۷۔ ایضاً، ص: ۲۰

۸۔ ایضاً، ص: ۴۶

۹۔ ایضاً، ص: ۱۶

۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۹

۱۱۔ ایضاً، ص: ۲۲

۱۲۔ ایضاً، ص: ۲۳

۱۳۔ ایضاً، ص: ۲۰

۱۴۔ ایضاً، ص: ۴۷

۱۵۔ احمد جاوید، نامعلوم سے بھی آگے، مشمولہ ''معلوم سے آگے'' از شہزاد احمد، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۵

☆☆☆